ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی

پاک و ہند کے فنِ تعمیر پر ایران و توران کا اثر

۱

برِ عظیم پاک و ہند میں ایرانی و تورانی فنِ تعمیر کے اثرات مسلمانوں کی آمد کے فوراً بعد ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ ان اثرات کے ابتدائی نقوش ہمیں مساجد کی تعمیر میں نظر آتے ہیں۔ مسلمان فاتحین نے اول دیبل کے مقام پر ایک مسجد تعمیر کی۔ اس کے بعد الرور کی فتح پر بھی مسجد تعمیر کی گئی۔ اسی ابتدائی پیش قدمی میں جب ملتان زیر نگیں آیا تو وہاں بھی مسجد تعمیر ہوئی جسے البیرونی نے "مسجد اموی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ مسلمانوں کی دوسری بڑی آمد سلطان محمود غزنوی سے شروع ہو جاتی ہے جس نے لاہور میں اپنی فتح کی یاد میں عرب محلہ قائم کیا اور مسجد کی بنیاد ڈالی۔ اس مسجد کے بارے میں ہمیں کچھ تفصیلات فخر مدبّر کی کتاب "آداب الحرب والشجاعہ" میں دستیاب ہیں۔ فخر مدبّر نے اسے "خشتی مسجد" لکھا ہے، جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی تعمیر پتھر کی بجائے اینٹوں سے کی گئی تھی۔ غزنی میں بھی سلاطینِ غزنی نے مساجد اور مینار تعمیر کیے تھے۔ محمود کی آمد سے پیشتر لاہور میں کوئی ایسی اسلامی عمارت نہ تھی جسے تعمیری روایت بنایا جا سکتا، اس لیے یہاں کی عمارات میں غزنی ہی کی روایت اختیار کی گئی۔ غزنوی سلاطین کا خاتمہ ۵۸۲ھ میں ہو گیا، اس کے بعد غوری خاندان کا دور دورہ ہوا اور مرکزی حکومت نے دہلی کو دارالحکومت قرار دیا۔ اس طرح مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا رواج دہلی میں بھی ہوتا چلا گیا۔ سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی میں مسجد قوۃ الاسلام ۵۹۴ھ میں تعمیر کی۔ یہ مسجد قیامِ سلطنتِ اسلامی کا اعلان ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کے فنِ تعمیر کی مسلسل روایت کا نشان بھی ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے اختتام تک برِ عظیم میں مسلمانوں کی تعمیرِ عمارات کی روایت وسیع ہو گئی۔ عہدِ خلجی اور تغلق تک مرکزی حکومت کا تسلط خاصا رہا، اس لیے مختلف صوبوں میں مرکزی روایت ہی کی پیروی ہوتی رہی۔

دسویں صدی ہجری کی ابتداء میں ظہیر الدین بابر نے فتح حاصل کی اور مغلیہ سلطنت ۱۲۵۰ھ تک قائم رہی، اس طویل عرصے میں بے شمار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ بعض عمارتیں حکومت کی طرف سے

مختلف علاقوں میں بنیں اور بعض شخصی طور پر تعمیر کی گئیں۔ ان عمارتوں کا طرزِ تعمیر ایران و توران سے گہری مشابہت رکھتا تھا۔

مساجد کی تعمیر مذہبی شعائر کی بجاآوری کی پابند تھی۔ اس لیے مسجد کے ضروری اجزاء کا عام معیار اور تعمیری نقشہ وہی تھا جو دوسرے مسلمان ملکوں میں رائج رہا۔ مقامی تعمیری ساز و سامان کی مجبوری اور مقامی معماروں کی وجہ سے بعض جزئی تبدیلیاں ضرور ہوئیں، لیکن مساجد کے عام رنگ روپ پر ایران و توران کی چھاپ گہری رہی۔

اول اول جو فاتحین آئے، ان میں ترک، افغان، ایرانی، عرب وغیرہ شامل تھے۔ ان آباد ہونے والوں کو جب کسی نئی عمارت کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے اپنے وطنِ قدیم ہی کی عمارتوں کے نقشے سامنے رکھے۔ یہ ایک فطری عمل تھا اور اس عمل کے ابتدائی نمونے مساجد میں نظر آتے ہیں۔ مساجد دیگر اقوام کے مذہبی عبادت خانوں سے اپنی ساخت اور شکل و شباہت کی وجہ سے مختلف تھیں۔ مسجدوں کے علاوہ فنِ تعمیر کے دوسرے نمونوں میں بھی ایران و توران کے کاریگروں کی ہنرمندی اور فنی وراثت کا ثبوت ملتا ہے۔

لاہور میں قطب الدین ایبک کی تاج پوشی قصرِ ہمایونی میں ہوئی۔ یہ محل آج ناپید ہے۔ اس زمانے تک بے شمار عمارتیں، اسلامی دنیا میں تعمیر ہو چکی تھیں، قیاس ہے کہ انھی کے نقشِ قدم پر اس محل کی تعمیر بھی ہوئی ہو گی۔ اس قیاس کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ "طبقاتِ ناصری" میں لکھا ہے کہ کئی ہزار کی تعداد میں سلجوقی ملتان میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ بہت بڑے ماہر تعمیر تھے۔

ہم نے ابتداء میں بیان کیا ہے کہ عہدِ سلاطینِ غوریہ میں مساجد تعمیر ہوئیں مگر ہنوز کسی مقبرے یا روضے کی عمارت کی تعمیر کی اطلاع دستیاب نہیں۔ مسلمانوں میں عالی شان مقبروں کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں اولین عمارات میں دریائے فرات کے کنارے قبتہ القلبیہ اہم ہے جس میں تین عباسی خلفاء یعنی المستنصر، المہتدی اور المتوکل دفن ہیں۔ یہ عمارت ۲۶۰ھ میں تعمیر ہوئی۔ پروفیسر کریسول کا خیال ہے کہ اسے ان عماراتِ مقبرہ میں شمار کرنا چاہیے جن پر باقاعدہ ہشت پہلو سطح کا گنبد تعمیر ہوا تھا۔ بعض محققین کو اس رائے سے اختلاف ہے۔ ان کے خیال میں صحیح عمارت مقبرہ جو آج بھی موجود ہے وہ اسماعیل سامانی کا مقبرہ ہے جو بخارا میں ۲۹۵ھ میں تعمیر ہوا۔ یہ عمارت نہایت اچھی حالت میں مربع سطح پر قائم ہے۔ مقبرے کا نصف کروی گنبد اپنے چاروں طرف چار چھوٹے چھوٹے برج رکھتا ہے اور قطری کمان پر قائم ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح معنوں میں گنبد کی تعمیر بخارا میں اسماعیل سامانی کے اسی مقبرے سے شمار کرنی چاہیے۔ مقابر کی تعمیر کا یہی انداز برعظیم پاک و ہند میں اختیار کیا گیا۔ جب دہلی میں سلطان شمس الدین التمش کا لڑکا ناصر الدین محمود ۶۳۲ھ میں فوت ہوا تو اس

کے مقبرے کے لیے ماہرین کو طلب کیا گیا۔ ان ماہرین نے وسط ایشیائی روایت پر دہلی میں مرحوم شہزادے کا روضہ تیار کر دیا۔ آج کل اسے "سلطان گڑھی" پکارتے ہیں۔ اس کا مشاہدہ واضح کرتا ہے کہ کاریگروں نے قطری کمان پر گنبد قائم کیا تھا۔ گنبد کی بناوٹ کا یہ طریق وسط ایشیائی ہے اور مقامی عمارتوں میں اس کے قدیم تر نشانات نہیں پائے جاتے۔ گنبدوں کی تعمیر کے سلسلے میں دوسری نمایاں مثال وہ ہے جس کا ذکر امیر خسرو نے "قران السعدین" میں کیا ہے۔ دہلی کی مسجد قوۃ الاسلام کے ضمن میں اس نے گنبدوں کا ذکر بھی کیا ہے مگر آج یہ گنبد عمارت پر موجود نہیں ہیں۔ خلجی سلاطین میں علاء الدین خلجی نمایاں حیثیت رکھتا ہے جس نے مسجد قوۃ الاسلام کی توسیع کا منصوبہ تیار کیا۔ یہ منصوبہ اگرچہ پورا نہیں ہو سکا، مگر مسجد کا ایک دروازہ اس کے نام پر "دروازہ علائی" کہلاتا ہے، یہ دروازہ ۷۰۹ھ میں مکمل ہوا۔ اس کا گنبد انہیں اصولوں پر ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ علاء الدین خلجی نے حضرت نظام الدین اولیاء کے احاطے میں پتھر کی ایک مربع عمارت تعمیر کی جسے آج "جماعت خانہ" پکارتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دراصل یہ عمارت بطور روضۂ حضرت نظام الدین اولیاء تعمیر ہوئی تھی، مگر حضرت نے اسے قبول نہ کیا، آج بطور مسجد موجود ہے۔ اس کا گنبد بھی انہیں قطری کمان کے اصولوں پر بنایا گیا۔

جب ۷۳۵ھ سے سلاطین تغلق کا زمانہ آیا تو عمارات میں ایک الگ ہی شان پیدا ہو گئی اور مقامی پتھر کی عمارات زیادہ تعمیر ہونے لگیں۔ ایک جدت یہ کی گئی کہ دیواریں خاص طور پر ترچھی کر دی گئیں۔ اس لحاظ سے سلطان غیاث الدین تغلق کا مقبرہ (دہلی) خاص حیثیت رکھتا ہے۔ اس دور میں سلطنت کے دوسرے علاقوں میں بھی عمارتوں کی وہی شان نظر آتی ہے۔ ملتان میں روضہ بہاء الدین زکریا اور روضۂ رکنِ عالم (۷۳۶ھ) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر مقبرہ ہشت پہلو سطح پر تعمیر ہوا ہے۔ ہند و پاک میں یہ اوّل عمارت ہے، جو اس سطح پر تعمیر کی گئی۔ ہشت پہلو سطح کے کونوں پر برجی نما مینار بھی ہیں۔ عمارت کی اس طرز کا براہ راست تعلق مقبرۂ خدا بندہ (سلطانیہ) سے معلوم ہوتا ہے۔ خدا بندہ کا مقبرہ بالکل اسی طرح روضۂ رکنِ عالم سے چند سال پیشتر ۷۰۴ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ طرز اتنا مقبول ہوا کہ ملتان کے گرد و نواح میں بھی کئی روضے اسی طرز پر تعمیر کیے گئے جن کے آثار اُچ اور میانوالی میں آج بھی پائے جاتے ہیں۔ مجھے گنبدوں کی اس طرز کے نشانات گجرات (کاٹھیاواڑ) کے اکثر مقامات پر ملے ہیں۔ اس سے اس زمانے میں ہندی فنِ تعمیر پر ایرانی و تورانی اثرات کی وسعت و مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ تغلقوں کی عمارات کے سلسلے میں کچھ اشعار بھی ملتے ہیں۔ محمد تغلق (متوفی ۷۵۳ھ) کی مدح میں بدر چاچ نے بہت سے قصاید لکھے ہیں ان میں ایک قصیدہ نگر کوٹ کی فتح (۷۳۸ھ) سے متعلق ہے۔ قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

خرم آباد بنا کردش شاہ — چو ظہیر الجیوش شد معمار
می کنند از کتابہاے درت — نظم مدح خلیفہ را تکرار
شد تمام ایں عمارت خرم — در محرم بہفصد و چل و چار

یہ قلعہ زیر نگرانی ظہیر الجیوش معمار ۷۴۴ھ میں تیار ہوا۔ محمد بن تغلق کے بعد فیروز تغلق کو عمارات کی تعمیر میں گہری دلچسپی رہی ہے۔ ان عمارات کے سلسلے میں اس نے خود ایک کتاب "فتوحات فیروز شاہی" لکھ دی۔

۲

سلطانی دور کا مجمل جائزہ سطور بالا میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے۔ کہ ایران و توران کے کئی ماہرینِ فن ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ انھی ماہرین نے ہند میں عمارات تعمیر کیں۔ بعض کے نام اب تک تاریخ کی کتب میں محفوظ ہیں۔ کچھ کا حال اس عہد کی تاریخوں اور عمارتوں کے کتبات میں ملتا ہے---

بہار میں جسے سب سے اول بختیار خلجی نے ۶۰۰ھ میں فتح کر لیا تھا، کسی تاتار خان نے ایک بادشاہ سلطان شاہ کا مقبرہ ۶۶۵ھ میں تعمیر کرایا تھا جس کا معمار مجد الکابلی تھا۔ یہ نام مقبرے کے کتبے میں درج ہے۔ جونپور میں جو شاہان شرقی کا پایہ سلطنت تھا۔ شرقی شاہوں نے متعدد عمارات اور "مسجد اٹالہ" وغیرہ یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ فنِ تعمیر کے ایسے نادر نمونے ہیں جنہیں دنیا میں بے مثال شمار کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر مسجد کے گنبدوں کا انتظام جن میں "صوت" کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ جونپور شہر دریائے گومتی کے کنارے واقع ہے۔ اس پر ایک یادگار پل ہے۔ اس پل کو اعلیٰ کمانوں پر ۹۷۲ھ میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی ہنرمندی نادر العصر استاد افضل علی الکابلی کے کمال فن کا نمونہ ہے۔ یہ زیر اہتمام منعم خان خان خاناں بعہد اکبر بادشاہ تعمیر ہوا۔ پل کے کتبے کے اشعار میں سے ایک یہ ہے۔

خانخاناں منعم عالم مدار
بست ایں پل را بتوفیق کریم

مغربی ہند یعنی گجرات میں مسلمان اول صدی اسلام میں آباد ہو گئے تھے اور یہاں ابتداء میں مسجد و مینار بھی تعمیر ہو گئے تھے، جن کا ذکر عوفی نے اپنی جامع الحکایات میں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وسط ایشیا کی روایات پر تعمیر ہوئے تھے۔ آج کھمبایت میں تغلق عہد کی بے شمار عمارات اور قبور ملتی ہیں۔ احمد آباد شہر میں ہم نے ۴۴۵ھ کی تعمیر شدہ مسجد دریافت کی تھی۔ ۸۱۰ھ میں یہاں مستقل صوبائی

سلطنت کا آغاز ہوا اور بے شمار عمارات تعمیر ہوئیں، جن کا طرزِ تعمیر مقامی تاثر لیے ہوئے ہے، مگر جب سلطان محمود بیگڑہ کا زمانہ آیا تو اس نے ترکی اسلامی فنِ تعمیر سے استفادہ کیا جس کے نمونے اسی عہد کی مسجد چانپانیر (۸۸۶ھ) میں پائے جاتے ہیں۔ جب محمود کو احمد آباد میں باغ کے احداث کی ضرورت محسوس ہوئی تو بقول مصنف "مرأۃ سکندری" اس نے ایک خراسانی ماہر کی خدمات حاصل کیں۔ اس کا سبب شاید یہ تھا کہ یہاں کے باشندے اس صنعت سے ناواقف تھے۔ ابتدائی عہد مغلیہ میں جب مغلوں نے گجرات کو عبدالرحیم خانخاناں کی قیادت میں ۹۸۰ھ میں فتح کر لیا تو عبدالرحیم خانخاناں احمد آباد میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ یہاں کے باشندے "حمام" کی نعمت سے محروم ہیں۔ گویا عمارت میں "حمام" کا یہ ایرانی اثر اس وقت تک شمالی ہند میں تو رائج ہو چکا تھا لیکن یہ علاقہ اس سے محروم تھا---

۳

مختلف صوبوں میں خود مختار صوبائی سلطنتیں آٹھویں صدی ہجری میں قائم ہو گئی تھیں۔ اگرچہ ان صوبائی نمونوں میں ایرانی تورانی اثرات پوری طرح جھلکتے ہیں تاہم ہر علاقے نے اس رنگ میں جزئی حسن پیدا کر لیا۔ گویا ان ریاستوں میں الگ الگ دبستان فنِ تعمیر قائم ہوئے۔ فنِ تعمیر کی یہ طرزیں تعداد میں پندرہ یا سولہ ہیں تاہم یہ تمام اسالیب فن ایرانی و تورانی اثرات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ فنِ تعمیر کے اعتبار سے مالوہ کی حکومت بہت اہم نظر آتی ہے جہاں بے شمار عمارتیں تعمیر ہوئیں اور قریب قریب ہر عمارت پر کتبہ موجود ہے۔ "کمال مولا" کی عمارت کے کتبے سے عیاں ہے کہ یہ عمارت ۸۶۱ھ میں تعمیر ہوئی اس کا معمار "الحاج الشیرازی الرشدی" تھا۔ اس عمارت کے کتبے سے ظاہر ہے کہ اکبر کے عہد میں طاہر محمد حسین عمادالدین بن سلطان علی سبزواری نے بھی معماری کی تھی۔ شہر کے دروازوں کو محمد حسین مشہدی نے ترتیب دیا۔ اتفاق سے ایک کتبہ (غالباً تانبے کی تختی پر) مندرجہ ذیل ملا۔ یہ کتبہ اتفاق سے ہوشنگ شاہ غوری کے مزار کے باہر آویزاں پایا گیا:

"بتاریخ نہم ربیع الثانی سنہ ہزار و ہفتاد ہجری فقیر حقیر لطف اللہ مہندس ابن استاد احمد معمار شاہجہانی و خواجہ جادو رائے و استاد شورام و استاد حامد بہمت زیارت آمدہ بود و دو کلمہ یادگار نوشت۔"

ان کتبوں سے پوری طرح آشکار ہے کہ مقام مالوہ میں اکثر ماہرین فن، قدیم عمارتوں کے مشاہدہ و مطالعہ کے لیے آتے تھے جن کے اسماء کتبہ میں درج ہیں۔ یہ نادرہ فن معمار عہدِ شاہجہانی سے متعلق تھے۔

دکن کی فتح دراصل اول سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں ۷۰۹ھ میں ہوئی تھی۔ جس کا مشہور سپہ سالار ملک کافور جنوب پر فوج کش ہوا تھا۔ یہاں مسلمانوں نے قلعے کا نام دولت آباد رکھا اور آج تک یہ اسی نام سے مشہور ہے۔ یہاں جو عمارتیں تعمیر ہوئیں، ان کا تعلق براہ راست ایران سے تھا۔ سبب یہ ہے کہ خود مختار سلطنت بہمنی ۷۴۳ھ سے قائم ہوئی۔ اس کا بانی سلطان علاء الدین حسن بہمنی ایرانی شہزادہ تھا۔ اس کے جانشین محمد شاہ بہمنی کے عہد میں دکن کے دوسرے دارالسلطنت گلبرگہ کے لیے مسجد جامع تعمیر ہوئی جو تمام عالم میں اپنی نوعیت کی واحد مسجد ہے۔ اس پر بے شمار گنبد ہیں اور مسجد کا کوئی صحن نہیں۔ تمام گنبد مقرنسوں اور قطری کمانوں پر قائم ہیں۔ معمار کا نام کتبہ میں اس طرح آیا ہے۔

"——تعمیر مساجد اللہ گ توفیقہ الشرایف رفیع بن شمس بن منصور القزوینی فی عہد السلطان محمد شاہ۔ سنہ تسع وستین وسبعمایتہ"

اس کا معمار رفیع بن شمس بن منصور قزوینی تھا جس نے اسے ۷۶۹ھ میں بادشاہ محمد شاہ کے عہد میں تعمیر کیا تھا۔

بہمنی سلطنت میں ایک مشہور فرماں روا "ولی بہمنی" ہے۔ اس کا روضہ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ بیدر میں ہے جو بہمنی سلاطین کا تیسرا دارالحکومت تھا۔ اسے تاریخوں میں محمد آباد کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس روضے کا معمار شکراللہ قزوینی تھا جس کا نام اس روضے کے گنبد کے حلقہ پر رقم ہے۔ روضے کے گنبد میں جو نقش و نگار حلقوں کے صورتوں میں خطاطی کی طرزوں، کوفی، نسخ، ثلث اور طغریٰ میں ہیں، دیکھنے کے قابل ہیں۔ زیادہ حیرت ناک طرز خطاطی کا کمال ہے کہ جس میں ایک ہی سطر میں دو طرز میں تحریریں منقش ہیں۔ خطاطی کے اس کمال کے علاوہ رنگوں کا امتزاج بھی بہت حیران کن ہے۔ روضے کو سرسری طور پر بھی دیکھا جائے تو سمرقند میں امیر تیمور کے روضے اور اس میں گہری قریبی مماثلت نظر آئے گی۔ دکن میں مدرسہ خواجہ محمود گاواں کی عمارت بھی قابل دید ہے کہ اس سے بھی ہماری اس رائے کو تقویت ملتی ہے کہ ان عمارتوں کو ایران کی بعض معروف عمارتوں کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ خواجہ محمود کے مدرسے کا پلین اور اصفہان کی مسجد جامع کا پلین آپس میں بہت مشترک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی معمار نے دونوں عمارتوں کو بنایا ہے۔ خواجہ محمود گاواں کی شہادت کی تاریخ ۸۸۶ھ "بیگنہ محمود گاواں شد شہید" سے نکلتی ہے۔ اس سے قبل مدرسے کی تاسیس کا زمانہ قیاس ہوسکتا ہے۔

میں نے جب مدرسہ محمود گاواں کو ۱۹۲۸ء کے اخیر میں چند احباب کے ہمراہ دیکھا تو مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں ایران و توران کے کسی بارونق شہر میں آگیا ہوں۔ یہاں غیر معرّق کاشی کاری کی شان ہی الگ تھی۔ پھر ستم یہ کہ مدرسے کا سامنا نصف حصہ بجلی کے گرنے سے قدرتی طور پر کٹ گیا ہے کہ

انسان سمجھتا ہے کہ اسے باقاعدہ کسی کاریگر نے آری سے کاٹ دیا ہے۔ ماتھے پر سر بسر قرآن کی آیاتِ از سورہ "زمر" وسیق الذی الی الجنتہ زمرا" نہایت اعلیٰ خطِ ثلث میں سفید زمین پر نیلے حروف میں مرقوم ہیں۔ کاتب نے اپنا نام "کتبہ العبد علی الصوفی" لکھا ہے۔ یاد رہے کہ اس کاتب کو خاص طور پر خواجہ نے شیراز سے مدعو کیا تھا۔ فرشتہ نے مدرسہ سے متعلق ایک قطعہ یوں درج کیا ہے۔

ایں مدرسہ رفیع محمود بنا
چو کعبہ شد ست قبلہ اہل صفا
آثار قبول بین کہ شد تاریخش
از آیت ربّنا تقبّل منّا

وہ لکھتا ہے کہ آج ۱۰۲۳ھ میں بھی یہ عمارت و مسجد و چار طاق بازار قدیم باقی ہیں اور ان کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی تیار ہوئے ہیں۔ مدرسۂ خواجہ محمود گاواں کے متعلق مقامی طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ بعہد اورنگ زیب عالمگیر یہاں مولانا امام الدین، امام مدرسین تھے اس دور میں ماہ رمضان میں بوقت نماز تراویح ایک حافظ سورۃ زمر تلاوت کر رہا تھا کہ مدرسے پر بجلی گری، نصف مدرسہ، نصف گنبد مقبرہ بادشاہ ہمایون بہمنی گر گئے۔

فرشتہ خواجہ محمود گاواں کے ایران سے روابط کی داستان بھی بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ فاضلِ عصر خراسان و عراق اکثر خواجہ کی خدمت میں تحفے اور ہدیے ارسال کرتے تھے اور سلاطین خراسان و عراق غائبانہ اس سے مشرف ہوتے تھے۔ فرشتہ کے بیانات کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مولانا جامی (متوفیٰ ۸۹۶ھ) خواجہ کی خدمت میں خطوط ارسال کیا کرتے تھے اور آپ کے نام ایک قصیدہ بھی ارسال فرمایا تھا، جس کا آغاز یہ ہے۔

مرحبا ای قاصد ملک معانی مرحبا

بیدر میں ہمایوں شاہ بہمنی کا مقبرہ اور چوکھنڈی کی عمارتیں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں بھی ایران کا براہ راست اثر واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ جو فن کار ایران سے یہاں آئے ان میں ایک کاتب کا نام "مطالعہ خان" تھا۔ یہ ایران سے آیا تھا۔ اس نے ولی بہمنی کے گنبد کے اندر قبور پر کتبات لکھے تھے۔

بہمنی سلطنت کا خاتمہ ۹۳۵ھ میں سلطان کلیم اللہ بہمنی کے عہد میں ہوا۔ اس کے بعد دکن پانچ مختلف صوبوں میں منقسم ہو گیا۔ شاعر نے یوں اظہار کیا۔

قطب شاہ و عادل، نظام و عماد
بریدی تھے بیدر میں فرحاں و شاد

فنِ تعمیر میں جو فروغ بیجاپوری سلطنت عادل شاہی میں ہوا، وہ بذات خود ایک اہم باب ہے۔ یہاں کی تعمیرات میں ابراہیم عادل شاہ کی مسجد، اس کی بیوی تاج سلطانہ کا روضہ اور محمد عادل کا روضہ (جو گول گنبد کے نام سے مشہور ہے۔) خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ ظاہر آصورت میں بیجاپوری عمارتیں کسی قدر مغل عہد کی عمارتوں سے مشابہ ہیں مگر عمارت میں استعمال ہونے والا مصالحہ مختلف ہے۔ ان عمارتوں کے معمار ترکی سے آئے تھے۔ ان میں دو ماہرِ فن ملک صندل اور ملک یاقوت خاص طور پر اہم ہیں۔ ان کے اسماء آثار پر کندہ ہیں۔ بیجاپوری عمارتوں میں گول گنبد خاص طور پر مشہور ہے۔ یہ دنیا میں سب سے بڑا گنبد ہے۔ اس کا قطر ۱۳۵ فٹ ۵ انچ ہے۔ اس میں صوت کا استقام کیا گیا ہے یعنی گنبد کے اندر قطر کے ایک طرف اگر گھڑی رکھ دی جائے تو گھڑی کی ٹک ٹک مقابل میں دوسری طرف برابر آتی ہے۔